© rasailojaraid.com

دیباچہ

موجودہ بین الاقوامی منظرنامے نے گذشتہ صدی کے دوران میں بہت وسعت اور پھیلاؤ اختیار کیا۔ دو عظیم جنگوں کی وجہ سے انسانیت نے جس صدمے اور پریشانی کا سامنا کیا اس نے قوموں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ متحد ہو جائیں اور اپنے وسائل و ذرائع اور توانائیوں کو انسانیت کی بہتری اور بھلائی کے لیے استعمال میں لائیں۔ بچوں کے حقوق سے لے کر ایٹمی پھیلاؤ تک، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بین الاقوامی طرزِ عمل کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے بھرپور بین الاقوامی حمایت اور بے مثال سُرعت کے ساتھ قوانین بننا شروع ہوئے۔

اگرچہ تنازعات اور اختلافات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے، تاہم مجموعی طور پر دنیا ایک پُرامن اور مشترکہ مستقبل کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ لیکن آج ہم خود کو ایک مشکل دوراہے پر کھڑا پاتے ہیں، جس کے ایک طرف انسانیت صدیوں کا بھرپور ورثہ لیے کھڑی ہے اور دوسری جانب دنیا کی بڑی طاقتیں اسے تباہ کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ بیسویں صدی میں انسان نے سیاست، دفاع، معیشت، مالیات اور سب سے بڑھ کر انسانی حقوق کے ضمن میں بڑی ترقی کی۔ اقوامِ متحدہ کا چارٹر، اقوامِ متحدہ کا انسانی حقوق کا منشور، جنیوا کنونشن اور اس کے علاوہ بہت سے دوسرے معاہدوں، کنونشنز اور اداروں نے عالمی امن اور ترقی کے لیے افراد اور اقوام کو مشترکہ بنیادوں پر سوچنے میں مدد دی۔ ہم ایک ایسی دنیا کی طرف جا رہے تھے جس میں جنگ خارجہ پالیسی کا لازمی حصہ نہیں تھی بلکہ بات چیت، مفاہمت اور قانون کے احترام کے ذریعے خارجہ پالیسی کو جنگ کے شکنجوں سے آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ ۹/۱۱ کے واقعے اور دُنیا کی واحد عالمی طاقت کے قابلِ نفرت ردّعمل نے عالمی دفاعی نظام کی بنیادیں تک ہلا ڈالی ہیں۔ قانون، انسانی حقوق اور بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی تصورات ازسرِ نو لکھے جا رہے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ازسرِ نو لکھنا دھاندلی اور من مرضی کا ہے۔ بات چیت اور معاملات کے پُرامن تصفیے پر اصرار فوجی طاقت کے سامنے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا یک طرفیت اور اس خطرناک راستے پر چل پڑی ہے جہاں فوجی اور معاشی برتری رکھنے والی کوئی بھی بڑی طاقت مختارِ کل بن بیٹھتی ہے۔ اقوامِ متحدہ -- جسے انسانیت کی بہت بڑی کامیابی سمجھا جاتا تھا -- آج اسی مقام پر کھڑی ہے جہاں ۱۹۴۰ء کے عشرے میں لیگ آف نیشنز تھی (یعنی چند بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں کھلونا)۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ۹/۱۱ کے واقعات کے ردّعمل کے طور پر کی جانے والی جوابی کارروائی، اس حملے کے مرتکب افراد کے خلاف نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے بڑے مذہب اور اس کے ہر ہر پیروکار کے خلاف کی گئی۔ ابھی تو دنیا ''وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں'' کے نام پر عراق پر حملہ کیے جانے کا جواز تلاش کر رہی تھی کہ تمام تر قوانین اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے افغانستان کے خلاف جنگ شروع کر دی گئی۔ ان طویل اور مشکوک مہمات نے مسلم دنیا کے نوجوانوں میں غصے اور نفرت کو ہوا دی۔ وہ تمام معاملات جو جدید بین الاقوامی نظام میں تقریباً طے پا چکے تھے، جیسے قومی ریاست کا تصور وغیرہ، ان پر پھر سے سوالات اُٹھائے جانے لگے۔ بین الاقوامی نظم وضبط، قوانین اور اداروں کو دنیا کی طاقتور اقوام کے ہاتھوں استحصال کے ایک ذریعے کے طور پر دیکھا گیا۔ دنیا کے تمام حصوں میں تشدّد کی لہر کو اپنے بھائی بند ساتھی میسر آ گئے۔ مغربی اقوام کی حکومتوں نے جنگ اور ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے عوام الناس کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے نفرت اور جنون پیدا کیا۔ اس سے افرادِ معاشرہ میں نفرت نے جنم لیا اور ذات پات، عقیدہ، کلچر اور تہذیب ابنِ آدمؑ اور بنتِ حوّاؑ کے درمیان پھر سے واضح وجۂ امتیاز بن گئے۔

تاریخ کے اس نازک اور اہم موڑ پر ہم ڈاکٹر محمود احمد غازی کے خطبات کو، جو انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں دیے، موجودہ شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ اِن خطبات کا مقصد اُن سوالات کا جواب دینا تھا جو ۹/۱۱ کے تناظر میں اسلام اور مسلمانوں کے بین الاقوامی کردار کے متعلق پیدا ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے سامنے خیالات کے نئے زاویے پیش کرنا بھی تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کہ انسانیت کے مستقبل کے متعلق فکر مند ہیں۔ لٰہذا یہ تحریر دو مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ ایک طرف تو یہ مسلمان عوام اور قائدین کو اپنے ماضی میں جھانکنے، موجودہ صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے لیے راہِ عمل متعین کرنے پر اُکساتی ہے۔ دوسری طرف یہ کاوش عالمی تہذیب کی راہ ہموار کرنے میں اسلام کے کردار اور ایک ایسے وقت میں جبکہ پائیدار امن کے تمام فارمولے ناکام ہوتے نظر آرہے ہیں، اسلام کی انسانیت کے لیے ایک متبادل کے طور پر صلاحیت کو سامنے لاتی ہے۔ اور اس موضوع کے فلسفیانہ اور عملی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔

میرے نزدیک اسلامی ریاست ایک نظریہ کی ترجمانی کرتی ہے کہ اقدار کس طرح افراد اور اجتماعیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثالی حالات میں تمام انسانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ خود کو جانوروں کی سطح سے بلند کرلیں اور اپنے اعمال کو ان اقدار اور اصولوں کی کسوٹی پر جانچیں جو عام طور پر تمام انسانوں میں مشترک سمجھے جاتے ہیں۔ ہر تہذیبی یا مذہبی سیاق میں اقدار کی اہمیت اور ان کا کردار مختلف ہوتا ہے اور وہ افراد جو اقدار کے کسی خاص نظام پر یقین رکھتے ہیں، اقتدار میں آتے ہیں تو ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ ان کا نظریۂ حیات اور طرزِ زندگی پھلے پھولے، وسعت پذیر ہو اور ترقی کرے۔ ریاست کا بجائے خود ایک مقصد ہونا، دورِ جدید کا تصور ہے اور اپنی اصلیت کے اعتبار سے یہ ایک فاشسٹ تصور ہے۔ جمہوریت سمیت تقریباً تمام سیاسی نظاموں میں ریاست کو مختلف اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ فطری امر ہے کہ مسلمان -- جو مخصوص اقدار اور مشترکہ تصورات رکھتے ہیں -- اس بات کی خواہش بھی رکھتے ہیں، اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے ہیں، کہ ان تصورات اور اقدار کو عملی جامہ پہنا سکیں، نہ صرف اپنی انفرادی زندگی میں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی جہاں تک ممکن ہو وہ ترغیب، تحریک اور قوتِ نافذہ کے ذریعہ اِسے روبہ عمل لاسکیں۔ اگرچہ دوسرے نظامِ ہائے زندگی کی طرح اسلام کا بھی طاقت کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور اسلامی ریاست کا مقصد خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق چند مقاصد کے حصول کے لیے کام کرنا، اقدار، عدل و انصاف اور عوام الناس کی بھلائی کو یقینی بنانا ہے۔ لیکن الہامی پہلو کے ساتھ ساتھ اس ساری مشق کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواز اتفاقِ رائے، قبولیت، عملی شمولیت اور لوگوں کی رضامندی سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اسلامی ریاست کے ذمہ دار افراد کو اس حقیقت کا ادراک کرنا پڑتا ہے کہ ایک طرف تو انہیں بامعنی شورائیت کے ذریعے عوامی رائے کو اپنے فیصلوں میں اہمیت دینا ہے اور دوسری جانب وہ اپنے تمام اعمال کے لیے روزِ قیامت علیم وحکیم اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس دوہری ذمہ داری کا احساس وہ تبدیلی لاتا ہے جس کے ذریعے قوت واقتدار بھلائی کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، نہ کہ ظلم وزیادتی کا ہتھیار۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بین الاقوامی قانون کے وہ تمام اصول وضوابط جو گذشتہ تین صدیوں کا حاصل سمجھے جاتے ہیں، درحقیقت اسلام کے بین الاقوامی قانون کی بنیادیں ہیں۔ بارہ سو سال سے زائد عرصے سے ان پر عمل ہوتا رہا ہے اور انہوں نے تہذیبوں، زبانوں، مذاہب اور عقائد کے تنوع کے باوجود حکمرانی کی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے بحیثیتِ مجموعی اپنے اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں تمام عقائد اور تہذیبوں کے ساتھ رواداری اور عمدہ طرزِ حکومت کی بہترین مثالیں قائم کی ہیں۔ شرکتِ اقتدار کا یہ پیغام انہیں ربّ کائنات -- اللہ -- کی دی ہوئی ہدایت کے ذریعے ملا جس نے انسان کی عظمت کے تحفظ پر اُبھارا، یہاں تک کہ اسے اپنے خالق اور قانون بنانے والے تک سے اختلاف کی آزادی عطا کی۔ عظمتِ انسان کے علاوہ دوسرا قانون جو اسلام کے شرکتِ اقتدار کے تصور کی وضاحت کرتا ہے وہ یہ اعتراف ہے کہ عین ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ہی وقت میں مختلف حیثیتوں میں مختلف شناختیں رکھتا ہو اور یہ مختلف شناختیں نہ صرف ایک فرد بلکہ معاشرے میں بھی پنپ سکیں۔ یہ امر لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایک قومیت کے سائے تلے، باوجود اپنی خصوصیات اور مختلف اعتبارات سے امتیازات کے، جمع ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بین الاقوامی قوانین اور سیاست میں حالیہ اور خاص طور پر پچھلی تین صدیوں میں، ہونے والی پیش رفت نے ریاست اور قومیت کی یکجائی کو ممکن بنایا ہے اور اس طرح اقلیتوں کے مسئلے کو نیا مفہوم اور نئی جہت عطا کی ہے۔ لیکن یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اقلیتوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موضوع پر حال ہی میں ہونے والے بحث مباحثوں میں اس پہلو پر توجہ نہیں دی گئی بلکہ اس کے بجائے مذہب کو وجہِ امتیاز و استحصال قرار دے کر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان مباحثوں میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان بہت سے مشترکات کو اہمیت نہیں دی گئی، جنہیں معاشرے کی مجموعی بہتری کے لیے سامنے لانے اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ مشترکات انسانیت کا اصل سرمایہ ہیں اور کئی صدیوں پر محیط کوششوں کا حاصل ہیں۔ ابراہیمی روایت کے حامل تینوں مذاہب -- اسلام، عیسائیت اور یہودیت -- نے تہذیبوں کے مابین ان مشترکات کی بنیاد فراہم کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر تہذیب کی اپنی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں لیکن ان کے درمیان مشترکات فطری طور پر زیادہ ہیں، کیونکہ تینوں مذاہب کا مأخذ و منبع مشترک ہے، یعنی اللہ -- خالقِ کائنات!

بین الاقوامی قوانین میں طاقت کا استعمال ہمیشہ سے اہم ترین موضوع رہا ہے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب میں اس موضوع کا ایک نئی جہت سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان خطرات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا جو مشترک انسانی اقدار کے خاتمے اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اخلاقیات سے فرار کے نتیجے میں پیدا ہو چکے ہیں۔ طاقت کا استعمال مخصوص حالات میں انسانی تجربے کا جزو لاینفک ہوسکتا ہے اور رہا ہے لیکن جو چیز زیادہ اہم ہے وہ ہے شائستگی، تحفظ، انصاف، خیر خواہی، زندگی کا تحفظ اور وہ سب چیزیں جو زندگی کو زندگی بناتی ہیں۔ اگر تو اِن مثبت اقدار کا تحفظ کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جائے، صرف اِسی صورت میں اس کے استعمال کا جواز ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کو بھی قانون اور اخلاقی اقدار کا پابند ہونا چاہیے۔ اسلام نے جنگ کے اس پہلو کو نہ صرف انسانی بنیادوں پر دیکھا ہے بلکہ اپنے متبعین کو جنگ کے اثرات کو کم سے کم کرنے کا پابند کیا ہے کہ وہ ان افراد اور اشیاء کو جو جنگ کے نتائج پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتے، ان کو زخمی کرنے یا نقصان پہنچانے سے حتی الامکان گریز کریں۔ اس سارے منظر نامے میں الہامی ہدایت کا اضافہ طاقت کو تہذیب اور انسانیت کی حدود پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بین الاقوامی قوانین کے ضمن میں گذشتہ صدی کے دوران میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے والی تیز رفتار ترقی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جدید جنگ کے طریقوں میں مزید بہتری لانا وقت کی ضرورت ہے، نہ کہ کچھ ریاستوں کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر وہ تمام بین الاقوامی قوانین جن کی بنیاد مشترکہ انسانی تجربے پر ہے، کو برباد کر کے رکھ دیں۔ اگر اس منفی رجحان کو نہ روکا گیا تو یہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان عالمانہ خطبات کو ڈاکٹر محمود احمد غازی (مرحوم) کی زندگی میں کتابی شکل میں نہ پیش کر سکے۔ ان کی وفات (۲۶ ستمبر ۲۰۱۰ء) اُن کے تمام جاننے والوں کے لیے صدمے کا باعث تھی۔ وہ اتنے عالی مرتبہ عالم اور عزیز رفیق تھے کہ ان کی جدائی سے محسوس کیے جانے والے دُکھ کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اس کتاب کے انگریزی مسودے کے بیشتر حصے کو بذاتِ خود دیکھا تھا اور اس پر نظرِ ثانی کے بعد اسے بہتر کیا تھا۔ اُنہیں اس کتاب کا شدت سے انتظار تھا، لیکن ان کا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملنے کا وقت ہر ایک کے اندازوں سے بہت جلد آن پہنچا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ دورِ حاضر میں اسلام کے عظیم اسکالرز میں سے ایک تھے اور دنیا بھر میں پھیلے ان کے شاگرد اور ان کی تحریریں انسانیت کے لیے رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی رہیں گی۔

خالد رحمٰن، ڈائریکٹر جنرل آئی پی ایس اور ٹیم کے دوسرے ممبران: عرفان شہزاد، ندیم فرحت گیلانی اور ماریہ خاور کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں حصہ لیا۔ اردو میں اس پیشکش کے لیے خصوصی طور پر برادرم متقین الرحمٰن، ثروت جمال اصمعی اور منزہ صدیقی شکریہ کے مستحق ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد
چیئرمین
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
اسلام آباد

© rasailojaraid.com